اسلام کا اقتصادی نظام

ابوالقاسم مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی

لغت کی زبان میں قصد و اقتصاد "میانہ روی" اور "اچھے چلن" کا نام ہے، مگر علمی اصطلاح میں ایسے وسائل کی "دریافت" کو کہتے ہیں جو دولت و ثروت کے پیدا کرنے کے مناسب طریقے، اُس کے خرچ کے صحیح استعمال، اور اُس کی ہلاکت و بربادی کے "حقیقی اسباب" بتا سکیں۔ اس لیے "علم الاقتصاد" اُس علم کا نام ہے جو ایسے وسائل سے بحث کرتا، اور اُس کے صحیح و غلط ہونے پر مطلع کرتا ہو۔

"علم اقتصاد" اس معنیٰ کے اعتبار سے دو حصّوں پر منقسم ہے۔ ایک "اجتماعی" اور دوسرا "انفرادی" یا "منزلی"۔ ہماری بحث کا نقطۂ نظر "اقتصادِ اجتماعی" ہے۔ اس لیے کہ یہی زندگی کی اصل بنیاد ہے اور "انفرادی و منزلی" کے لیے دلیلِ راہ۔

قدیم و جدید علمی دنیا کے مفکّرین، اور علماءِ بصیرین نے اس مسئلہ کو علمی اور عملی دونوں طریقوں سے حل کرنے کی برابر سعی کی ہے اور آج تک اُس سعی کا سلسلہ جاری ہے۔ یونان کے مشہور فلسفی "افلاطون" نے بھی اپنی کتاب "جمہوریت" میں اس مسئلہ پر اپنا نقطۂ نگاہ بیان کیا ہے۔ اور علماءِ جدید میں کیسل (Cassel) مِل (Mill) اسمتھ (Smith) ریکارڈو (Roscher) اور جون (Jhon) نے اس مسئلہ کو علمی اور عملی بنانے میں جو کاوشیں کی ہیں وہ اُن کی تصانیف اور اُن کے نظریوں سے واضح ہے اور آخر میں کارل مارکس (Karl marx) نے نظریۂ "اشتراکیت" (Socialism) اور اُس کے "عملی پروگرام" کے ذریعے یورپ میں جو انقلاب پیدا کیا اُس نے علمی حلقے "علمی نظام" اور "طرزِ حکومت" پر جو اثر ڈالا ہے اور

وہ موافقت و مخالفت کے رنگ میں نہ صرف یورپ کو متاثر کر رہا ہے بلکہ ایشیا اور مشرق و مغرب کے تمام گوشوں میں زبردست ہیجان برپا کیے ہوئے ہے۔ اور روس جو آج کل اشتراکیت کا عملی میدان بنا ہوا ہے دوسروں کو بھی اس نظام میں منسلک کرنے کے لیے پیہم جد و جہد کے ساتھ سرگرم عمل ہے۔

اس سلسلہ میں جہاں تک صرف نظریوں "تھیوریز" کا تعلق ہے ہمارے مضمون زیر بحث سے اُن کا کچھ زیادہ علاقہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ ہم اس وقت ایک ایسے نظام سے بحث کرنا چاہتے ہیں جو دنیاءِ انسانی کی ضروریات اور اُن کی عملی معیشت کے لیے بہترین پروگرام "نظامِ عمل" رکھتا ہو، یا یوں کہیے کہ وہ عام انسانوں کی اجتماعی اور انفرادی معیشت کا کفیل ہو۔ اور "تنازع للبقاء" کے میدان میں ہر ایک انسان کو زندہ رہنے، اور حسب استعداد ترقی کرنے کا پورا پورا حق دیتا ہو! البتہ اس مسئلہ کو بحث کا موضوع بناتے وقت "مذاہبِ عالم" کی تاریخ کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے تاکہ عدل و انصاف کے ساتھ یہ موازنہ کیا جا سکے کہ "عقل و نقل" کی تطبیق کی جد و جہد میں دنیا کے پیش کردہ نظاموں میں سے کون سا نظام اپنے اندر ایسی لچک رکھتا ہے جو اپنے بنیادی اور اصولی قوانین کو ہاتھ سے دیے بغیر مادی ترقیات کے دور میں بھی دینی اور اُخروی فلاح کی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیوی بہبودی کے لیے مشعل راہ بن سکتا ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اوّل اُن مبادیات کو بیان کر دیا جائے جو تمام عقلاء کے نزدیک اس مسئلہ میں "اصولِ موضوعہ" کی حیثیت رکھتے ہیں، اور اُن ہی کی روشنی میں اس کو حل کیا جا سکتا ہے۔ اور پھر اسلام کے اقتصادی نظام کو واضح کیا جائے، اور سب سے آخر میں عقلاءِ زمانہ اور مذاہبِ عالم کے اقتصادی نظام پر بطور موازنہ کے کچھ لکھا جائے۔

اصولِ موضوعہ: جیسا کہ ابھی کہا گیا کہ "اقتصادی نظام" کی اس لیے ضرورت پیش آتی ہے کہ ہر ایک انسان میں یہ فطری جذبہ ہے کہ اُس کو زندہ رہنے کا حق ہے، مگر جب یہ انفرادی جذبہ "کشمکشِ حیات" میں ایک دوسرے سے ٹکراتا ہے تو فطرت یا قانونِ قدرت (جو خدائے قادر کی جانب سے تمام عالمِ ہست و بود پر حاوی ہے) انسان کو

اجتماعی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتے ہیں، مگر یہ اجتماعی حیات بغیر کسی نظام کے وجود پذیر نہیں ہو سکتی تو اب اُس کے لیے ایک ایسے نظام کی ضرورت پیش آتی ہے جو اُس کے "فطری حق" کا کفیل اور ضامن ہو، اور ہر ایک انسان کو یہ حق دیتا ہو کہ وہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں سے حسبِ قوت و استعداد فائدہ حاصل کر سکے، اور اس استفادہ میں کوئی قانون یا کوئی قوت اُس کی مزاحم نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ وہ نظام معیشت اور اسبابِ معیشت کے لیے ایسے قوانین بیان کرے جس سے دولت اور دولت کے وسائل سے ہر ایک انسان فائدہ اُٹھا سکے، اور اس کا سدِ باب کرتا ہو کہ خدائے برتر کی یہ نعمتیں کسی خاص "فرد" یا خاص گروہ میں سمٹ کر نہ رہ جائیں۔ اس بنا پر اقتصادی نظام کے لیے حسب ذیل بنیادی اصول ہر عاقل کے نزدیک قابلِ تسلیم، اور بطور اصولِ موضوعہ کے ناقابلِ انکار ہیں۔

(۱) وہ ہر متعلقہ فرد کی معاشی زندگی کا کفیل ہو اور جماعت کا کوئی فرد بھی عملی جد و جہد کے بعد اُس سے محروم نہ رہے۔

(۲) ایسے اسباب کا قلع قمع کرتا ہو جس سے دولت یا اسبابِ دولت افرادِ انسانی میں حاکم و محکوم کا علاقہ قائم کرنے میں ذریعہ بنتے ہوں۔

(۳) دولت اور اسبابِ دولت کو کسی خاص فرد یا خاص جماعت کے اندر محدود ہونے سے روکتا ہو۔

(۴) محنت اور سرمایہ کے درمیان صحیح توازن قائم کرتا ہو۔

"اصولِ موضوعہ" کے پہلے نظریہ کی تشریح کی تو کوئی حاجت نہیں اس لیے کہ وہ خود اس قدر واضح ہے کہ آپ اپنی تشریح ہے، کون نہیں جانتا کہ خالقِ کائنات کے یدِ قدرت نے جب بے جان اجسام مثلاً جمادات (اینٹ پتھر) کو اپنی کائنات میں قیام و سکون کی جگہ دی ہے تو جاندار اجسام کو پیدا کر کے اُن کی معیشت کے لیے کوئی سامان مہیا نہیں کیا یہ کیسے قابلِ تسلیم ہو سکتا ہے؟ اور اگر کیا ہے اور یقیناً کیا ہے۔ تو پھر اُس میں کسی کی تخصیص کے کیا معنی؟ کیوں ہر ایک "جان" کو یہ موقعہ میسر نہ ہو کہ وہ اس دنیائے فانی میں اپنی معیشت

کے بدولت فائدہ اٹھاسکے۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (پارہ ۱۲) (سورۂ ہود) — زمین پر رینگنے اور چلنے والے ہر جاندار کے رزق کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہے

وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ — اور تمہارا رزق اور وہ شے جس کا وعدہ دیے گئے ہو آسمان میں (یعنی اللہ تعالیٰ کے ذمہ) ہے۔

یہاں "رزق علی اللہ اور رزق فی السماء کے یہی معنی ہیں کہ اس کائنات ارضی میں ہر جاندار کو زندہ رہنے کا حق ہے۔ اور قدرتِ الٰہی کے دستِ کرم نے ہر فرد کو عطاءِ وجود کے ساتھ ساتھ اس کی مدتِ بقاء کے لیے خود ہی وسیع سامان مہیا کر دیے ہیں اور اس نے کسی کو محروم المعیشت یعنی اسبابِ زندگی سے محروم پیدا نہیں کیا۔

دوسرے نظریہ کا مقصد یہ ہے کہ "نظام" میں ایسی گنجائش نہیں ہونی چاہیے جو دولت میں تقسیم اور پھیلاؤ کی جگہ "ذخیرہ" اور "جمع" کی ایسی صورت پیدا کرے جس سے ذاتی "اسٹیٹ" کا قیام عمل میں آکر افرادِ انسانی کو صرف "دولت" کی بنا پر حاکم اور محکوم دو حصوں میں بانٹ دے، اور اس طرح جماعتی نظام کی ہمہ گیری کا وہ فائدہ جو جماعت کے ہر فرد کو پہنچنا چاہیے تھا ایک خاص فرد یا خاص جماعت کے مصالح اور مقاصد کی خدمت کے لیے وقف ہو جائے، کیونکہ یہی وہ مہلک "جرثومہ" ہے جو نہ صرف افراد کو بلکہ اقوامِ عالم کو باہم ایک دوسرے پر ظلم و عدوان کرنے اور دستِ تظلم بڑھانے پر آمادہ کرتا، اور نہ صرف یہ بلکہ محکوم بنا کر محکوم قوم کی بڑی تعداد کو معاشی وسائل سے محروم کر دیتا ہے، اور ان کے فطری حقِ زندگی کو سلب کر لیتا ہے، اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ "معاشی دستبرد" محکوم قوم کو اس کے مذہبی، سیاسی، علمی، اقتصادی غرض تمام حقوقِ انسانیت کو ختم کر کے اور اس کو انسانیت کے درجہ سے گرا کر اور حیوان بلکہ بیجان اجسام کی طرح بنا کر فنا کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔

إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا — بیشک فرعون نے زمین (مصر) میں اودھم مچا رکھا ہے اور اس کے

شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ○ وَنُرِيدُ أَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ ○ (القصص رکوع ۱)

باشندوں میں پھوٹ ڈال کر پارٹیاں بنا دی ہیں، ان میں سے ایک گروہ کو کمزور کرتا رہتا ہے، اُن کے لڑکوں کو ذبح کرتا اور اُن کی لڑکیوں کو باقی رہنے دیتا ہے وہ یقیناً مفسدوں میں سے ہے اور ہمارا ارادہ یہ ہے کہ ہم کمزوروں پر احسان کریں اور اُن کو رہنما بنائیں اور اُن کو وارث بنائیں۔

فرعون کی یہ حرکت "کہ مصر کی حکومت پر ذاتی "اسٹیٹ" قائم کر کے محض دولت و ثروت کے بل بوتے پر بنی اسرائیل اور قبطیوں میں پھوٹ ڈلواتا تھا اور ایک کو حاکم اور دوسرے کو محکوم بنا کر محکوم قوم کو ذلیل و رسوا کرتا تھا اور خدا کی زمین پر اُن کے تمام حقوق کو چھین کر اُن کو کمزور بناتا تھا، اللہ تعالیٰ کو اسی لیے ناگوار ہے کہ اس طرح حاکمیت اور محکومیت کا یہ مفسدانہ طریقہ محکوم قوم کی معیشت کے تمام ذرائع حاکم اور حکمراں قوم کی مصالح اور اُن کے مفاد کے لیے وقف کر دیتا ہے اور اس طرح وہ زندگی کے حق سے محروم ہو کر انسان ہونے کے باوجود بے جان اجسام کی طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، بلکہ آہستہ آہستہ تمام حقوقِ زندگی سے بھی محروم ہو کر جلد ہی فنا کے گھاٹ اُتر جاتے ہیں۔

تیسرے نظریہ کا حاصل یہ ہے کہ وہ نظام ایسے قوانین کا حامل نہ ہو جن کے ذریعہ سے دولت اور اسبابِ دولت سمٹ کر کسی خاص جماعت یا گروہ میں محدود ہو جائیں اور قوم کے افراد کا ایک بہت بڑا حصہ "قوت لایموت" کا بھی حقدار نہ رہے، بلکہ اس کے برعکس "جمع" و "ذخیرہ" کی بجائے تقسیم کے ایسے طریقے بتاتا ہو جس سے دولت کا مفاد قوم کے تمام افراد تک وسیع ہو سکے، اور سرمایہ داری کے اصول کے خلاف دولت بٹ کر سب میں پھیل جائے۔

كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ (حشر)

(فقراء، مساکین، قرابت داروں، یتیموں وغیرہ پر اللہ نے جو یہ خرچ کرنے کا طریقہ بتایا ہے، اس لیے ہے) تاکہ ایسا نہ ہو کہ مال و دولت صرف دولتمندوں ہی میں محدود ہو کر رہ جائے۔

ورنہ جس جماعت کو "سرمایہ داری" کا گھن لگ جاتا ہے پھر اُس کے عام افراد کی زندگی سخت خطرہ میں پڑجاتی ہے اور اس کا سب سے زیادہ مکروہ اور گندہ پہلو یہ ہے کہ خود قوم کے بعض اعضا ہی دوسرے اعضا کو تباہ کرنے، اور کرم کی طرح چاٹ لینے میں جری اور بے باک ہو جاتے، اور ایسا کرنے کو اپنا اخلاقی حق سمجھنے لگتے ہیں، اور اس وجہ سے نہ صرف اسی پر اکتفا کرتے ہیں بلکہ اس "ظلم" کو قائم رکھنے کے لیے مکر و فریب بے رحمی و بے حیائی جیسی بداخلاقیوں کو تیزفہمی، ہوشیاری اور معاملہ داری کا نام رکھنے سے ادنیٰ سی بھی جھجک محسوس نہیں کرتے، اور آخر کار جسم کے اعضا ہی میں تصادم و تزاحم پیدا ہو جاتا ہے اور "محنت" و "سرمایہ" کے نام سے آپس میں وہ جنگ عظیم برپا ہوتی ہے کہ ساری قوم کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور بعض اوقات قوم کی قوم ہلاکت تک پہنچ جاتی ہے۔

چوتھے نظریہ کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی تمام زندگی کا صرف دو ہی چیزوں پر انحصار رہے۔ ایک "محنت" اور دوسرے "سرمایہ" لیکن یہ ظاہر ہے کہ ایک شخص کے پاس اگر سرمایہ کا قطعاً کوئی وجود نہ ہو مگر وہ محنت کرسکتا ہے تو اسباب کی موافقت قلیل عرصہ میں اُس کو سرمایہ پیدا کرا سکتی ہے، مگر اس کے برعکس کوئی شخص سرمایہ رکھتا ہے لیکن محنت کے لیے ایک لمحہ کو بھی تیار نہیں تو تھوڑی ہی مدت میں وہ اس سرمایہ کو ختم کر کے مفلس و قلاش ہو جاتا ہے، اسی فرق کو محسوس کرتے ہوئے سرمایہ دار ایک دوسری صورت اختیار کرتا ہے، وہ یہ کہ سرمایہ کو ترقی دینے کے لیے ایسے اصول تیار کرتا، اور اقتصادی نظام میں ان کو عمدہ شکلوں اور صورتوں کے ساتھ شامل کر کے فائدہ اٹھاتا ہے، جو بغیر محنت کے تحصیلِ زر کے ذرائع پیدا کرتے ہوں اور اس طرح محنت کی قدر و قیمت کو گھٹا کر باقی سارے نظام کو بھی ایسی سطح پر لے آتا ہے کہ تمام کاروبار میں محنت ایک بے حیثیت چیز رہ جاتی ہے، اور سرمایہ کا درجہ بہت بلند نظر آنے لگتا ہے۔

ایسی صورت میں وہ "نظام" ایسا ہونا چاہیے کہ جو مذکورہ بالا خرابیوں کو کسی طرح رونما ہونے سے روکے اور پوری پوری طرح اُن کا سدباب کر دے۔ اور ایسے قوانین کا واضع ہو جس سے "محنت" اور "سرمایہ" کے درمیان

ایسا توازن پیدا ہو جائے کہ سرمایہ اور محنت کے درمیان کشمکش کے جو اسباب پیدا ہو جاتے، اور تخریب نظام عالم کا باعث بنتے ہیں وہ یک قلم فنا ہو جائیں۔

یہ چوتھا نظریہ دراصل گذشتہ تین نظریوں کے تسلیم کر لینے کا قدرتی نتیجہ ہے یعنی اگر بیان کردہ تینوں نظریے صحیح اور معقول ہیں (جیسا کہ اجمالی طور پر ذکر ہو چکا اور عنقریب تفصیل سے معلوم ہو جائیگا) تو چوتھا نظریہ خود بہ خود یقینی ہے۔

ہم نے ان اصول کو "اصولِ موضوعہ" اس لیے کہا ہے کہ "علم اقتصاد" کا سب سے بڑا مقصد اور اُس کی اصل غرض و غایت یہ ہے کہ معاشی نظام میں ایسا کوئی خلل پیدا نہ ہو سکے کہ جس سے جماعت کے افراد یا انسانوں کے باہم معیشت "وجہ تصادم بن جائے، اور کوئی ایک فرد بھی اُس کی بدولت حصولِ معیشت سے محروم رہ جائے۔ تو اس اصل کے پیشِ نظر آنے والی تفصیل سے آپ خود اندازہ کر سکینگے کہ "اگر اقتصادی نظام" میں ان اصول سے باہر کوئی رُخ بھی اختیار کیا جائیگا وہ اعتدال سے جدا" افراط یا تفریط ہے۔ اور اعتدال کی راہ، ایک اور صرف ایک ہی ہے اور وہ ان ہی بیان کردہ "اصول" پر متفرع ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ بعض "نظریے" اپنے منطقی دلائل کے اعتبار سے بہت زیادہ جاذبِ نظر، اور دلکش معلوم ہوتے ہیں، اور "اقتصادی نظام" یا معیشت کے پروگرام میں اس اعتبار سے اُن کی بہت اہمیت نظر آتی ہے، لیکن عملی میدان میں جب وہ "تجربہ کی "خراد" پر آتارے جاتے ہیں، تو بعض تو بالکل ہی ناکارہ اور غیر مفید ثابت ہوتے ہیں، اور بعض اگرچہ کچھ کارآمد ضرور ہوتے ہیں لیکن نظری اہمیت کے مقابلہ میں اُن کی عملی اہمیت بہت ہی ہیچ نظر آتی ہے۔

اس کے برعکس بعض نظریے اپنی صحتِ دلائل کے باوجود نئی اصطلاحات، جدید تعبیرات، ماحول کے اثرات کے لحاظ سے پہلے نظریوں کے مقابلہ میں برتر تو کیا مساوی بھی نہیں محسوس ہوتے...... لیکن عملی تجربہ میں اُن کی افادیت بہت بلند اور امن عالم کے لیے بہت زیادہ موزوں ثابت ہوتی ہے۔

لہذا "عملی نظام" میں وہی نظریے قابلِ قدر جگہ پانے کے مستحق ہیں جو اگرچہ تعبیری لفظہ نظر سے بہت اہم، انقلاب آفریں، اور سحور کن نظر آتے ہوں مگر عملی دائرہ میں اس قدر وسیع، اور ہمہ گیر ہوں کہ اگر ان کو دلیل راہ بنا لیا جائے تو معیشت اور اقتصادی امور میں "امنِ عالم" کے لیے وہ تنہا کفیل ہو سکیں۔

ہمارا مطلب اس سے یہ نہیں ہے کہ قدیم اور جدید زمانہ کے جُدا جُدا تاثرات، ماحول کے اختلافات، ذہنی انقلابات و رجحانات کے اعتبار سے وہ اپنی تفصیلات و فروع میں بھی یکساں، اور غیر متبدل ہوں کیونکہ انسانی درجاتِ ترقی و تنزل کے پیش نظر یہ ناممکن ہے۔

البتہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے نظری اور عملی اصول و قواعد کے اعتبار سے یقیناً ایسی مضبوط بنیاد و اساس رکھتا ہو کہ زمانہ کے ہزاروں انقلابات، لاکھوں نئے نئے تاثرات و ذہنی رجحانات کے باوجود اُس میں وسعت، لچک تو پیدا ہو سکے اور ہوتی رہے لیکن اساس و بنیاد کا ایک نقطہ بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹ سکے، اور اُس کا نظری پیغام، اور اس کا عملی پروگرام اعلیٰ سے اعلیٰ ترقی یافتہ اقوام کے لیے بھی اسی طرح مشعلِ ہدایت کا کام دے جس طرح اقوام سابقہ کے لیے کام دیتا رہا ہے۔

ان تمہیدی مقدمات کے بعد اب مسئلہ کی تشریح و توضیح زیادہ آسان ہو جاتی اور حصولِ مقصد کے لیے ایک صحیح راہ نکل آتی ہے، اور ایسے اہم موضوع کے لیے سمجھنے اور سمجھانے کا جو مرحلہ ہے وہ دقت طلبی، اور پیچیدگی سے نکل کر آسان اور روشن شاہراہ پر پڑ جاتا ہے اور کسی قسم کی کوئی گنجلک باقی نہیں رہتی۔